رائے عامہ کی تبدیلی اور اجتماعی سرگرمیاں

سید سعادت اللہ حسینی

اگست 2024 کے شمارے میں ہم نے جماعت اسلامی ہند کے میقاتی منصوبے کے حوالے سے لکھا تھا کہ اس میقات میں رائے عامہ کی تبدیلی کو جماعت کا 'میقاتی مشن' قرار دیا گیا ہے اور یہ طے کیا گیا ہے کہ جماعت اپنی تمام سرگرمیوں اور تگ و دو کو اس طرح منظم کرے گی کہ ان کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں رائے عامہ پر مثبت اثر پڑے۔ اس موضوع پر کچھ ضروری اصولی باتیں عرض کر دی گئی تھیں۔ اب یہاں ذیل کی سطروں میں، عملی کاموں اور توجہ طلب امور کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس خاکے سے اندازہ ہوگا کہ ہماری ہرطرح کی اجتماعی سرگرمیاں کیسے رائے عامہ کی تبدیلی کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور کیسے تمام شعبے، ادارے اور ہرطرح کے اجتماعی کام، رائے عامہ پر اثر اندازی کے مرکزی ہدف کے حصول میں اپنا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ یہ ہدف صرف جماعت کی ضرورت نہیں ہے۔ امت کے تمام طبقات کی یہ منصبی ذمے داری بھی ہے اور موجودہ حالات میں امت کی اہم ترین ضرورت بھی ہے کہ رائے عامہ پر مثبت اثر پڑے۔ اس لیے ہماری چھوٹی بڑی ملی و دینی تنظیمیں، سیاسی ونیم سیاسی جماعتیں، نوجوانوں کی انجمنیں، فلاحی و رفاہی مراکز، تعلیمی ادارے غرض یہ کہ ملت میں موجود تمام اجتماعی ہیئتیں اپنی سرگرمیوں کے ذریعے اس اہم ہدف کے حصول میں کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ہماری ان سب سے استدعا ہے کہ وہ اس خاکے پر غور فرمائیں اور اپنی تگ و دو اور کاوشوں کو رائے عامہ میں مثبت تبدیلی کا ذریعہ بنائیں۔ کارکنان جماعت کی بھی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ امت کی تمام سرگرمیوں کو یہ رخ دینے کی کوشش کریں اور کوشش کریں کہ امت کے ہر طبقے کی ہر سرگرمی رائے عامہ کو سدھارنے کا ذریعہ بنے۔

برادرانِ وطن سے ربط وتعلق

رائے عامہ کی مثبت تبدیلی کے لیے سب سے زیادہ ضروری کام یہی ہے کہ مسلمانوں کا برادرانِ وطن سے زیادہ سے زیادہ ربط وتعلق ہو اور اہم مسائل پر تبادلہ خیال کے مواقع مسلسل ملتے رہیں۔ ان صفحات میں اس سے قبل ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ کیسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فاصلے بڑھتے جارہے ہیں اور یہ صورت حال کس قدر نقصان دہ ہے۔[1] مسلسل مظالم اور زیادتیوں کے ردعمل میں خود مسلمانوں کے بعض طبقات میں یہ منفی ردعمل بھی کہیں کہیں نظر آنے لگا ہے کہ وہ خیر سگالی اور گفتگو و تبادلہ خیال کی ہر تجویز اور ہر کوشش کو شک اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ بڑا غیر صحت مند اور سخت مہلک رجحان ہے۔ اس امت کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک داعی امت ہے اور سخت سے سخت اشتعال کی فضا میں بھی اپنی اس حیثیت کو فراموش کرنا اس کے لیے نہ تو جائز ہے اور نہ اس کے مفاد میں ہے۔ حدودِ شریعت کا لحاظ رکھتے ہوئے نیز اظہارِ حق اور ظلم و ناانصافی کی مزاحمت کے معاملے میں کسی مداہنت کے بغیر، برادرانِ وطن اور ان کے مذہبی وسماجی رہ نماؤں کے ساتھ خیر سگالی کی صبر کے ساتھ مسلسل کوشش نہایت ضروری ہے اور اس کے بغیر رائے عامہ پر اثر اندازی ممکن نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے موجودہ حالات میں درج ذیل امور پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

ان سب امور کے حوالے سے مثالی رویوں کے بہت سے نمونے ملک کے مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ جماعت اسلامی ہند اور اس کے کارکنان بھی ملک کے طول وعرض میں خیر سگالی و اعتماد، ربط باہم اور صحت مند مذاکرات کی فضا کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں اور ان کوششوں کے اچھے نتائج بھی بر آمد ہورہے ہیں۔ بعض دیگر ادارے اور تنظیمیں بھی اس محاذ پر سرگرم ہیں، لیکن جس تیزی سے فرقہ وارانہ فضا کو مسموم کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں، اس کے تناظر میں یہ ضرورت بہت زیادہ شدید ہوگئی ہے کہ ان کوششوں کی رفتار اور ان کا دائرہ بہت زیادہ بڑھایا جائے اور پوری امت اس کام کو مہماتی انداز میں لے کر آگے بڑھے۔

(۱) مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سماجی سطح پر قریبی تعلقات پیدا ہوں اور ایک عام غیر مسلم کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں سے ربط و تعلق کے اور ان کو قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور مذاکرہ و گفتگو کے مواقع ملتے رہیں۔ ایسی صورت حال پیدا ہونی چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایک عام غیر مسلم کی سوچ ٹی وی چینلوں، سوشل میڈیا پوسٹوں اور جھوٹے ویڈیو کے ذریعے نہ بنے بلکہ جو رائے بھی بنے وہ راست مسلمانوں سے تعامل اور ان کو دیکھ کر اور سن کر بنے۔ ہمارا خیال ہے کہ موجودہ احوال میں یہ کم سے کم ہدف ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کو مستقبل قریب میں جلد سے جلد حاصل کر لینا چاہیے۔ اس کے لیے پہلی ضرورت یہی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کا سماجی رابطہ کم سے کم کرنے کا جو رجحان پیدا ہو رہا ہے، اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس مسئلے کے دینی اور سماجی پہلوؤں پر اس سے قبل ہم تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔[2] رابطوں کا کم ہونا ہمارے خیال میں منفی رائے عامہ کے لیے ذمہ دار ایک اہم عامل ہے اور موجودہ حالات میں اگر صرف رابطے و تعلقات ہی بڑھ جائیں تو ان سے بھی رائے عامہ کی درست رخ پر تبدیلی میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ اس کے لیے ہمارے خیال میں درج ذیل عملی کوششیں مسلسل مطلوب ہیں:

(الف) مسلمان زیادہ سے زیادہ برادران وطن سے قریبی سماجی رابطہ پیدا کریں۔ یہ کام ہر میدان میں ہو یعنی طلبہ و طالبات، دفتروں اور کمپنیوں کے ملازمین، ڈاکٹر، وکلا اور دیگر پیشوں سے وابستہ پیشہ ور، تاجر، مزدور، کسان، خانہ دار خواتین، سبھی میں یہ بیداری لانے کی مسلسل کوشش کی جائے کہ وہ اپنے تعلقات اور پیشہ ورانہ روابط صرف مسلمانوں تک محدود نہ رکھیں، بلکہ برادران وطن سے بھی زیادہ سے زیادہ رابطے و تعلق کی شعوری کوشش کریں۔

(ب) جہاں ممکن ہو وہاں، مشترکہ علاقوں میں رہائش اختیار کریں۔ ایسی جگہیں مستثنیٰ ہو سکتی ہیں جہاں فسادات اور بدامنی وغیرہ کا عام ماحول ہو، لیکن ہر جگہ الگ تھلگ رہنے کے بڑھتے رجحان کو روکنے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں کی رہائشوں کو الگ تھلگ کرنے کی طاقت ور کوششیں فرقہ پرستوں کی جانب سے بھی ہو رہی ہیں اور بعض صورتوں میں مسلمانوں کا اس پر اختیار بھی نہیں ہے۔ لیکن خود مسلمانوں کی جانب سے، جس حد تک بھی ممکن ہو یہ کوشش ہونی چاہیے کہ آبادیاں ملی جلی رہیں۔

مستقل پڑوس میں رہنے سے حقیقت کو سمجھنے میں جتنی مدد ملتی ہے اتنی کسی اور ذریعے سے نہیں ملتی۔ ماضی میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو مثبت رائے عامہ رہی ہے اس کی بڑی وجہ صدیوں سے ساتھ رہنے کی روایت ہے۔ آج بھی ملک کے بعض علاقوں میں ساتھ رہنے کی وجہ سے حالات بہتر ہیں۔ خصوصاً بڑے شہروں میں اب اس صورت حال کو بدلنے کی جو کوشش ہو رہی ہے وہ ہماری سنجیدہ اور شعوری توجہ چاہتی ہے۔

بہر حال، کسی مسلم آبادی کا الگ تھلگ ہونا عدم تعلق کے لیے وجہِ جواز نہیں بننا چاہیے۔ جو لوگ خالص مسلم بستیوں میں رہتے ہیں وہ بھی اس تعلق سے اپنی ذمے داری کو محسوس کریں اور دوسری آبادیوں میں جا کر برادرانِ وطن سے ربط و تعلق کی شکلیں نکالیں۔ دوسری بستیوں میں موجود تفریح گاہیں، تجارتی مراکز اور کمیونٹی سینٹر وغیرہ بھی ربط و تعلق قائم کرنے کے مواقع مہیا کر سکتے ہیں۔

(ج) ایک بڑا مسئلہ زبان کا مسئلہ ہے۔ زبان صرف دو افراد کے درمیان رابطے اور کمیونی کیشن کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ دو قوموں اور گروہوں کے درمیان بھی صحت مند کمیونی کیشن کا وسیلہ ہوتی ہے۔ ادب، فنون لطیفہ، تقاریر و مواعظ، میڈیا و سوشل میڈیا، لٹریچر اور علوم و فنون، یہ سب صرف کسی فرقے کے اندرونی باہم کمیونی کیشن (intracommunity communication) کا ہی ذریعہ نہیں ہیں بلکہ دو فرقوں کے درمیان کمیونی کیشن (intercommunity communication) کا بھی اہم وسیلہ ہیں۔ جب فرقوں کی زبانیں الگ الگ ہوجاتی ہیں تو اس کے نتیجے میں ایک طرح کا مواصلاتی خلا (communication gap) فطری طور پر پیدا ہوجاتا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دوسرے فرقے کا ادب کن افکار و احساسات کی ترجمانی کر رہا ہے، اس کے مذہبی قائدین کیا نصیحت کر رہے ہیں، اس کا پریس کن مسائل کو اہمیت دے رہا ہے اور اس کے نوجوان سوشل میڈیا پر کن جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ مواصلاتی خلا (communication gap) اعتماد کی فضا کو مجروح کرنے میں بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ ملک کے کئی علاقوں میں یہ فضا عام ہے۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ مسلمان علما، قائدین، اہل علم اور عام نوجوان مقامی زبان سیکھنے پر توجہ دیں (انگریزی کافی نہیں ہے)، اور مسلمانوں میں مقامی زبانوں کے ادیب، فن کار، صحافی اور دانش وران و محققین زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں اور جو موجود ہیں ان کی

بھرپور سرپرستی، تعارف اور تعاون ہو۔

(د) خاندانوں کے درمیان ربط وتعلق اور میل ملاپ کو فروغ دیا جائے۔ شادی بیاہ اور تقاریب میں جانے آنے کے عمل کو بڑھایا جائے۔

(ھ) سماجی رابطے کے دیگر محاذوں پر مثلاً مشاغل اور ان کے فورموں، خواتین کی سرگرمیوں، علمی وپیشہ ورانہ فورموں، کھیلوں کی ٹیموں، تجارتی تعاون باہمی کے اداروں وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی شمولیت اور بین مذہبی روابط کی ہمت افزائی ہو۔

(۲) عید ملن وغیرہ طرز کے روایتی پروگراموں کی اب پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے اختراعی طریقے سوچنے اور اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن سے مسلمانوں کی مختلف مذہبی، سماجی اور معاشرتی قدروں سے برادران وطن راست متعارف ہوسکیں۔ حالیہ دنوں میں مسجدوں میں برادران وطن کو مدعو کرنے کا رجحان شروع ہوا ہے۔ اس کو بڑے پیمانے پر فروغ دیا جاسکتا ہے۔ جمعہ کے خطبوں میں، تراویح اور رمضان کے خصوصی پروگراموں میں، نکاح کی سادہ مسنون تقاریب میں (یاد رہے کہ خلاف دین رسومات اور سامانِ نمائش پر مشتمل تقریبات میں شرکت الٹا اسلام کی منفی شہادت کا ذریعہ بنتی ہے) نماز جنازہ اور تدفین میں، حج کے تربیتی پروگراموں میں، شادی اور ازدواجی زندگی سے متعلق تربیتی پروگراموں میں، زکوۃ وفطرے کی اجتماعی تقسیم کے مواقع پر، غرض ایسی تمام جگہوں پر برادران وطن کو مدعو کیا جانا چاہیے جہاں وہ اسلام کی مختلف تعلیمات کو جان سکیں، ان تعلیمات پر مسلمان کس طرح عمل کرتے ہیں اس کو راست دیکھ سکیں اور ان کی عملی برکتوں کا مشاہدہ کرسکیں۔

(۳) سوشل میڈیا میں برادران وطن کے ساتھ انگیج ہوں۔ سوشل میڈیا پر ایکو چیمبر بن جانے کے مسئلے اور اس کے نقصانات پر اس سے قبل ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔[3] اس بات کی ضرورت ہے کہ محلوں اور کالونیوں کی سطحوں پر اور پیشوں یا دل چسپیوں کی اساس پر مشترک وہاٹس اپ گروپ بنائے جائیں۔ ہر سمجھ دار مسلمان زیادہ سے زیادہ برادران وطن کے ساتھ مربوط ہو اور اس کے سوشل میڈیا

وقت کا ایک قابل لحاظ حصہ برادران وطن کے لیے مختص ہو۔ دیگر سوشل میڈیا پلیٹ فارموں پر زیادہ سے زیادہ بین المذہبی رابطے کو فروغ دیا جائے۔ سوشل میڈیا کے ذریعے رائے عامہ پر اثر اندازی کے لیے ضروری ہے کہ تین بڑے نقصان دہ رجحانات کی ہمت شکنی ہو اور انھیں روکا جائے۔ پہلا رجحان، اشتعال انگیز اور شر انگیز سوشل میڈیا انگیجمنٹ کا رجحان ہے۔ گالی کے جواب میں گالی، اشتعال کے جواب میں اشتعال، وسیع تر تعمیم (sweeping generalisation)، ذات پات یا مذہبی عقیدوں و رسوم کے حوالے سے تحقیر و تذلیل، الفاظ و لہجے میں دانستہ نفرت و حقارت کی آمیزش، ناروا طنز تشنیع اور جاہلانہ حمیت و عصبیت کو بھڑکانے کی کوشش۔ اگرچہ یہ رجحانات ہندوستانی مسلمانوں میں عام نہیں ہیں۔ ایسی پوسٹیں نظر بھی آتی ہیں تو زیادہ تر ان کا سرچشمہ بیرون ملک ہوتا ہے۔ لیکن چند پوسٹیں بھی ماحول کو زہر آلود کر دیتی ہیں اور پوری بحث کو بہت غلط اور مہلک رخ دے دیتی ہیں۔ اس لیے ان کی روک تھام ضروری ہے۔ ایسا طرز عمل نہ تو دین کی تعلیم کے مطابق ہے نہ اس کی کوئی ضرورت و افادیت ہے بلکہ شدید نقصان دہ ہے۔ سوشل میڈیا پر دوسرا نقصان دہ رجحان انتہاپسندانہ نقطہ نظر، سیاسی، مذہبی اور مسلکی مواقف میں شدت اور اس کا اظہار اور شدت و مبالغے کے ساتھ حالات کو بیان کرنے کا رجحان ہے۔ اس سے بھی رایوں پر مثبت اثر اندازی کا عمل مشکل ہوجاتا ہے اور تیسرا رجحان[4] اسلام کے تعارف میں ترجیحات و ترتیب کا لحاظ کیے بغیر ہر اہم وغیر اہم بحث میں الجھ جانے کا رجحان ہے۔ اس پر ہم اگست کے شمارے میں 'اعراض خوض'[5] کے قرآنی اصول کے حوالے سے گفتگو کر چکے ہیں۔

(۴) ان کے علاوہ جن امور و مسائل کو عام غیر مسلموں میں اسلام کے خلاف غلط فہمیوں اور نفرت کے فروغ کا ذریعہ بنایا جارہا ہے ان پر مسلسل افہام و تفہیم کی نشستیں منعقد کرانے کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک، جہاد و قتال سے متعلق اسلام کی تعلیمات، خاندان اور خواتین سے متعلق احکام، گوشت خوری، حلال ذبیحہ، وطن اور اہل وطن سے تعلق وغیرہ جیسے مسائل پر اسلام کا موقف وضاحت کے ساتھ اہل ملک کے سامنے لایا جانا چاہیے۔ اسلامی تعلیمات سے متعلق دفاعی کاوشوں کے ساتھ ساتھ، ملک اور سماج کے اہم مسائل اور ان پر اسلام کے موقف کی معقولیت بھی سامنے لائی جانی چاہیے۔ ذات پات اور سماجی نابرابری، دولت کا ارتکاز اور معاشی تفاوت، خواتین کے خلاف مظالم اور جنسی

آوارگی وغیرہ جیسے مسائل پر مسلسل بات چیت ہو تو اسلام کے موقف کی معقولیت کو سمجھنا لوگوں کے لیے زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ ان مسائل پر صرف بڑے بڑے پروگراموں کے بجائے افہام و تفہیم کی زیادہ سے زیادہ چھوٹی چھوٹی نشستوں کا اہتمام ہونا چاہیے، جس میں لوگوں کو اپنے دل کی بات صاف صاف کہنے کا اور اپنے اعتراض اور دل کی کھٹک کو سامنے لانے کا موقع ملے اور سنجیدہ ماحول میں ان اعتراضات کا ازالہ بھی ہوسکے۔ اس طرح سے، سماج کے ہر طبقے خاص طور پر نوجوانوں کے طبقات کو مخاطب بنانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے اہل علم کو بھی بڑے بڑے مجمعوں میں یک طرفہ تقاریر کے ساتھ ساتھ، اس طرح کی چھوٹی نشستوں میں نتیجہ خیز ٹیبل ٹاک اور افہام و تفہیم کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے۔

اصلاح معاشرہ کی کوششیں

اس سے قبل یہ وضاحت ہوچکی ہے کہ رائے عامہ پر اثر اندازی کے لیے صرف کمیونی کیشن اور قولی شہادت کافی نہیں ہے بلکہ عملی نمونوں کا سامنے آنا اور عملی شہادت پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ عملی نمونے زیادہ موثر طریقے سے رائے عامہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عملی شہادت موثر طور پر اسی وقت ہوسکے گی جب ہم مسلمانوں کے معاشرے عملاً زیادہ سے زیادہ اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہوں۔ اس لیے اصلاح معاشرہ کے کام کا ایک پہلو دعوتی بھی ہے۔ یعنی مسلم معاشرے کی اصلاح اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر ملک کی رائے عامہ پر مثبت اثر ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ اس ضرورت کا تقاضا جہاں یہ ہے کہ اصلاح معاشرہ کی کوششیں تیز سے تیز تر ہوں وہیں ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ یہ کوششیں اس طرح منظم کی جائیں کہ ان کے ذریعے رائے عامہ پر اثر اندازی کا ہدف بھی حاصل ہوسکے۔

ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رائے عامہ کی خرابی کے لیے صرف مسلمانوں کے رویے ذمے دار ہیں۔ ظالم فرقہ پرست طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اور ان کی شرانگیزیاں، رائے عامہ میں بگاڑ کے لیے ذمے دار ایک بہت اہم عامل ہے۔ اس کا یقیناً بھرپور مقابلہ ہونا چاہیے۔ لیکن ہمارے رویے کی معمولی غلطی بھی ان ریشہ دوانیوں کی کام یابی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ ہم اصلاً اپنے رویوں کے ذمے دار ہیں۔ اس لیے اس حوالے سے خود احتسابی اور اصلاح کی کوشش مستقبل کو بہتر بنانے کی تدبیر کا نہایت اہم حصہ ہے۔

سب سے پہلی ضرورت تو یہی ہے کہ مسلم معاشرے کی اصلاح ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ اسلام کا عملی نمونہ بنے۔ دوسری ضرورت یہ بھی ہے کہ مسلم معاشرے میں اس گئی گزری حالت میں بھی جو خوبیاں پائی جاتی ہیں، ان کو نمایاں کیا جائے۔ اس ضرورت پر بھی گذشتہ مضمون میں ہم اظہار خیال کر چکے ہیں[6]۔ ان کے علاوہ کچھ اور اہم پہلو جن پر اصلاح معاشرہ کی کوششوں میں توجہ درکار ہے، وہ ہمارے خیال میں درج ذیل ہیں۔

(۱) مسلم معاشرے کی ان خرابیوں کی اصلاح پر خاص توجہ دی جائے جو ہندوستان کے موجودہ ماحول میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق رائے عامہ کو بگاڑنے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ اصلاح معاشرہ کی کوششوں میں یہ ایک بڑی کم زوری ہے کہ وہ اسلامی اخلاق کے چند پہلوؤں ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں اور اخلاق کے دیگر اہم شعبے صرف مسلمانوں کے اجتماعی رویوں ہی میں نہیں بلکہ اصلاح حال کی جدوجہد میں بھی بری طرح نظر انداز ہیں۔ اس موضوع پر ہم اپنی کتاب 'اصلاح معاشرہ: منصوبہ بندی عملی طریقے' میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔[7] ہمارے خیال میں درج ذیل اخلاقی خرابیوں کا رائے عامہ کو منفی بنانے میں اہم رول ہے۔ اس لیے ان پر خصوصی توجہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

(ا) صفائی وطہارت: ذاتی نظافت کے علاوہ محلوں، سڑکوں، گھروں وغیرہ کی صفائی، خاص طور پر مسجدوں اور مذہبی تقاریب سے متعلق امور میں صفائی و نظافت کا اعلی معیار، قربانی کے موقعے پر صفائی کا اہتمام۔ ناپاکی اور گندگی کے مناظر کراہیت کا فوری تاثر قائم کر دیتے ہیں اور رائے کو غلط رخ دے دینے اور اس میں عصبیت کے عنصر کی آمیزش کے ساتھ شدت پیدا کرنے میں یہ کراہیت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

(ب) راستوں کے اور پڑوسیوں کے حقوق: اس سے قطع نظر کہ دوسرے لوگوں کا طرز عمل کیا ہے اور وہ کیسے زیادہ بڑی اخلاقی خرابیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ ضروری ہے کہ مسلمان اسلام کی تعلیمات کا مجسم نمونہ بنیں اور اپنے رویوں سے اسلام کی تعلیمات کی شہادت دیں۔ راستوں کے حقوق اور پڑوسیوں کے حقوق کے سلسلے میں اسلام بہت حسّاس ہے۔ اسلام کے مذہبی شعائر کے تعلق سے ایسی کوئی عملی شہادت ہر گز نہیں سامنے آنی چاہیے جو اسلام کی تعلیمات سے راست متصادم ہو۔ بے ہنگم

پارکنگ، بلا کسی شدید ضرورت کے راستوں پر نماز کا اہتمام، لاؤڈ اسپیکروں کا بے جا استعمال[8] آبادیوں میں اور بلڈنگوں کے باہر نوجوانوں کے جمگھٹے، رات بھر موٹر سائیکلوں کا شور، چائے خانوں کا شور شرابہ، دیر رات فنکشن ہالوں میں ہنگامے، اس طرح کے بہت سے امور ہیں جو ملک کے کئی علاقوں میں مسلمانوں کی شناخت کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں اور ان کے تعلق سے ناگواری اور بے زاری کے احساسات کو فروغ دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر مذہبی گروہوں کے تیوہاروں میں جو ہنگامے آئے دن برپا ہوتے ہیں وہ اپنی اذیت ناکی میں کئی گنا بڑھے ہوئے ہیں لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا مسلمانوں کی حیثیت صرف ایک قوم کی نہیں ہے کہ وہ ایسے معاملات کو مسابقت اور قومی کشاکش کا موضوع بنائیں۔ وہ اصلاً اسلام کے اخلاقی اصولوں کے علم بردار ہیں اور ہر حال میں ان اصولوں کی قولی و عملی شہادت ان کی اصل ذمہ داری ہے۔

(ج) خواتین سے متعلق امور: یہ غلط فہمی عام طور پر پائی جاتی ہے کہ اسلام خواتین کے ساتھ نعوذ باللہ عادلانہ سلوک نہیں کرتا۔ اس غلط فہمی کا بڑا سبب جہاں پروپیگنڈا ہے وہیں اس پروپیگنڈے کو تقویت دینے میں بعض مسلمانوں کے وہ رویے بھی ذمے دار ہیں جو اسلام کی تعلیمات سے انحراف اور مقامی تہذیبی اثرات کو قبول کرنے کا نتیجہ ہیں۔ خواتین کو وراثت میں حصہ نہ دینا، ان کے مالی حقوق ادا نہ کرنا، مسجدوں میں ان کے داخلے کو قطعی طور پر ممنوع سمجھنا[9]، بعض دینی حلقوں میں ان کی اعلیٰ تعلیم اور معاشی سرگرمی کو لے کر غیر ضروری اور غیر اصولی تحفظات، طلاق کے اختیار کا بے جا اور غیر منضبط استعمال، ان کی سماجی سرگرمی کے حوالے سے نامناسب تحفظات، اس طرح کے متعدد رویے ہیں جن کا آج بھی کئی حلقوں میں چلن عام ہے۔ ہمارے مذہبی طبقات کی جانب سے، دوسری اخلاقی خرابیوں کے معاملے میں تو صرف خاموشی اور بے اعتنائی کا رویہ ہے لیکن خواتین کے معاملے میں بہت سی خرابیوں کا بعض اوقات برملا دفاع بھی کیا جاتا ہے۔ حالیہ دنوں میں لڑکیوں کی کالج کی تعلیم کو منقطع کرانے کی باقاعدہ اپیلیں بھی ہوئی ہیں۔ رائے عامہ کی درست رخ پر تبدیلی کے لیے ان سب غیر اسلامی رویوں کی اصلاح ضروری ہے۔[10]

(د) مالی امور و معاملات: تجارتی و مالیاتی اخلاق اسلام کا ایک نہایت اہم امتیاز رہا ہے اور اسلام

کی دعوتی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے بہت سے علاقوں میں فروغِ اسلام میں ایک اہم کردار مسلمانوں کی دیانت داری اور ان کے معاملات نے ادا کیا ہے۔ آج بھی بہت سے مسلمان ہیں جو اس کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر عام مسلمان معاشرے کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب مسلمانوں کا یہ امتیاز باقی نہیں رہا۔ بعض جگہوں پر تو یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ اس معاملے میں مسلمانوں کے رویے عام سماج سے بھی فروتر ہیں۔ کئی جگہوں پر یہ بات مشہور ہے کہ مسلمان شراب، سور کے گوشت، حرام ذبیحہ وغیرہ کے سلسلے میں تو حساس ہیں لیکن یہ حساسیت کسبِ مال میں حرام سے بچنے کے سلسلے میں بہت کم ہے۔ تجارت اور لین دین میں دھوکہ دہی کی کیا صورت حال ہے؟ ملازمین بلکہ دین دار ملازمین بھی وقت کی پابندی کرتے ہیں یا وقت کی چوری کے لیے بدنام ہیں؟ مسلمان کاری گروں اور پیشہ وروں کے یہاں وقت کی پابندی کرنے اور وقت پر کام کو مکمل کرنے کے حوالے سے کیا صورت حال ہے؟ یہ درست ہے کہ پڑوسیوں کی زمینوں پر دست درازی اور تعمیر کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ سڑک کی زمین ہتھیالینا ملک میں عام رویہ ہے۔ کرپشن، ٹیکس کی چوری وغیرہ جیسے متعدد مالی معاملات ہیں جن کے حوالے سے ہمارے ملک میں آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ لیکن ہمارے لیے اہم تر سوال یہ ہے کہ اس حوالے سے مسلمانوں کی صورت حال بہتر ہے یا ابتر ہے؟ ان سب سوالات کے حوالے سے، ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ملک کے اکثر علاقوں میں شاید صورت حال اچھی نہیں ہے۔ شراکت داری کے اصول، مل جل کر ایک دوسرے کے فائدے کے لیے اور ایک دوسرے کو ضروری رعایت دیتے ہوئے بڑی تجارتیں کرنے کی صلاحیت، باہمی معاملات میں شفافیت، ضروری راز داری اور اعتماد باہمی کا اہتمام وغیرہ جیسے امور میں اجتماعی کم زوری ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی پسماندگی کے اسباب میں شامل ہے۔ یہ سب رویے بھی اسلام کی معکوس شہادت اور نتیجتاً رائے عامہ پر منفی اثر کے لیے ذمے دار ہیں۔ اس جائزے کی بھی ضرورت ہے کہ کہیں غیر متوازن عصبیتیں اور ردعمل کی نفسیات ہم کو اخلاقی اصولوں سے منحرف تو نہیں کررہی ہیں۔ مثال کے طور پر حکومت کی زیادتیاں اور ناانصافیاں ٹیکس کے معاملے میں ہمیں لاپروا تو نہیں بنارہی ہیں؟ جلسے جلوسوں میں بلا ٹکٹ جانے کا دوسرے فرقوں کا معمول، ٹکٹ وغیرہ کے معاملے میں ہماری حساسیت کو تو کم تو نہیں کر رہا ہے؟ ہمارے خیال میں اس بات

کی ضرورت ہے کہ ان تمام امور کو اصلاحی کوششوں کا اہم ہدف بنایا جائے۔

(۲) رائے عامہ پر اثر اندازی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اوپر ذکر کیے گئے امور کے حوالے سے، ملک کی رائے عامہ کے سامنے یہ بات آئے کہ مسلمانوں کی دینی و اصلاحی تحریکیں اور ان کے زعما ان امور کے سلسلے میں حساس ہیں اور ان کے سلسلے میں اصلاح کے لیے فکرمند اور کوشاں ہیں۔ مثلاً اگر مسلمان تین طلاق پر حکومت کے قانون کے خلاف تو بہت زیادہ بے چین ومتحرک نظر آئیں لیکن یہی بے چینی طلاق بدعی کی روک تھام کے سلسلے میں نظر نہ آئے، خطبوں میں طرح طرح کے سماجی وسیاسی موضوعات زیر بحث آئیں لیکن طہارت و پاکیزگی جیسے سماجی مسائل پر کبھی گفتگو نہ ہو تو ہمارے ملک کے مسلم معاشرے کی عملی کم زوریاں اسلام کے ساتھ وابستہ ہونے لگتی ہیں اور اسلام اور پوری مسلم امت کے سلسلے میں منفی تاثر قائم ہونے لگتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی برائیوں کے سلسلے میں اسلام کا نقطہ نظر صاف صاف سامنے آتا رہے اور ان معاملات میں اصلاح کی کوششیں ہوتی ہوئی لوگوں کو نظر آئیں اور ہمارا دینی بیانیہ محض ایک قوم کے جذبات اور رویوں کا دفاعی بیانیہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ اصلاً اسلام کی اصولی تعلیمات کا ترجمان بنے۔

ملی وملکی امور اور سیاسی محاذ

یہ بات بھی ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں کہ سیاست نام ہی اصلاً رائے عامہ پر اثر اندازی کا ہے۔ ملی وملکی مسائل اور سیاسی جدوجہد کی تنظیم بھی اس طرح ہونی چاہیے کہ ان سے رائے عامہ کو متاثر کرنے میں مدد ملے۔ ان محاذوں پر ہر کام کرتے ہوئے یہ ضرور دیکھا جانا چاہیے کہ اس سے رائے عامہ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اس حوالے سے درج ذیل پہلو قابل توجہ ہیں:

(۱) سیاسی مسائل میں ہمارا عوامی بیانیہ اور جدوجہد صرف مسلمانوں سے متعلق امور تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔ رائے عامہ پر اثر کے حوالے سے یہ سب سے زیادہ نقصان دہ رجحان ہے۔ اس رجحان کے نتیجے میں ہم خود ہی ملک کے عام سماج سے اپنے آپ کو کاٹ لیتے ہیں اور اپنے خلاف تعصب اور جانب دارانہ آرا اور رویوں کے لیے ساز گار ماحول پیدا کر لیتے ہیں۔ اس سے قبل وضاحت آچکی ہے

کہ رائے عامہ پر اثر اندازی کے لیے اپنائیت کا ماحول ضروری ہے اور یہ ماحول ہر گز پیدا نہیں ہوسکتا اگر ہم اپنے پڑوسیوں کے بڑے بڑے مسائل پر خاموش رہیں اور ہماری ساری سر گرمی اور ہنگامہ خیزی صرف اُن امور و مسائل تک محدود رہے جو مسلمانوں کے مسائل سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) ملی اور سیاسی مسائل پر مہمات چلاتے ہوئے اس بات کا لحاظ ضرور ہو کہ ان کا طریقہ، انداز کار، ذرائع وسائل، زبان اور لب ولہجہ ایسا ہو جس سے عوامی رائے پر مثبت اثر ڈالنے میں مدد ملے۔ یہ ان مسائل کے حل کے لیے بھی ضروری ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے رائے عامہ پر اثر اندازی کے اصل اور طویل المیعاد مقصد کا بھی تقاضا ہے۔ بدقسمتی سے اکثر دفعہ شعوری یا لاشعوری طور پر، جذبات کی تسکین اور امت کے اندر پائے جانے والے غم و غصے کا مداوا، اصل مقصد بن جاتا ہے اور ایسی مہمات کی تفصیلات کے تعین کے وقت یہی مقصد ذہن پر حاوی رہتا ہے۔ بلاشبہ اس مقصد کی بھی اپنی اہمیت ہے لیکن اس کو اتنی اہمیت دینا کہ وہ رائے عامہ کی تبدیلی کے مقصد پر فوقیت حاصل کرلے اور محض جذبات کی تسکین کی خاطر رائے عامہ میں بڑے پیمانے پر بگاڑ کو قبول کرلیا جائے، ہر گز کوئی معقول رویہ نہیں ہے۔

(۳) مختلف امور و مسائل پر ہم اس طرح موقف اختیار کریں، بولیں اور تحریکیں چلائیں کہ ان کے نتیجے میں اسلام کی مختلف تعلیمات بھی واضح ہوتی رہیں۔ یہ کام اسلام کے نام کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے اور ضرورتا نام کے بغیر بھی ہو تو مسلمانوں کی جانب سے اجتماعی طور پر آنے والی بات اسلام کی بات سمجھی جائے گی اور رائے عامہ پر اثر اندازی میں ضرور کردار ادا کرے گی۔مثلاً بجٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہم ضرور اسلام کی غریب پروری، دولت کی منصفانہ تقسیم، فلاح و بہبود پر مرکوز، ماحول دوست اور قدروں پر مبنی اسلام کا ترقیاتی ماڈل، دولت کی افزائش اور اس کی تقسیم میں توازن وغیرہ امور کو زیر بحث لائیں۔ وقف بل پر احتجاج صرف غیظ وغضب کے اظہار تک محدود نہ ہو بلکہ وقف کی اسلامی تعلیمات اور ان تعلیمات کے انسانیت دوست مقاصد بھی وضاحت کے ساتھ سامنے آئیں۔

(۴) احتجاجی و دفاعی سیاست کے علاوہ اقدامی سیاست کی بھی ہم عادت ڈالیں۔ اس ملک میں دلتوں کے مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں؟ معاشی نابرابری کے خاتمے کا راستہ کیا ہوسکتا ہے؟ پولیس کو کیسے

زیادہ سے زیادہ انصاف پسند اور شہریوں کا دوست بنایا جاسکتا ہے؟ انصاف کے نظام میں کیسے عدل پروری اور تیزی و سرعت پیدا کی جاسکتی ہے؟ اس طرح کے مسائل کو ہم اپنا سیاسی ایجنڈا بنائیں (اس موضوع کو بھی ہم تفصیل سے اپنی کتاب 'ہندتو انتہا پسندی: نظریاتی کشمکش اور مسلمان' میں زیر بحث لاچکے ہیں[11]۔) اگر مسلمانوں کا ایک قابل لحاظ طبقہ اس طرز کی نظریاتی سیاست کا عادی ہوجائے تو رائے عامہ کی مثبت رخ پر تبدیلی کی راہ ہموار ہونے لگے گی۔

(۵) اوپر بیان کی گئی چاروں باتوں کا لحاظ صرف ملکی اور ریاستی سطح کے بڑے امور و مسائل میں نہیں بلکہ ضلع، شہر، گاؤں، کالونی وغیرہ کی سطح کے خالص مقامی سطح کے مسائل میں بھی ہونا چاہیے۔ ان سطحوں پر اختیار کیے جانے والے رویے بھی رائے عامہ پر اثر اندازی کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لیے مقامی سطحوں پر بھی مسلمانوں کے مخصوص مسائل کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کے مسائل پر بھی ہم کام کرتے رہیں، یہاں بھی اقدامی سیاست ہو، ان سطحوں پر بھی اسلام کے مواقف سامنے آتے رہیں اور یہاں بھی ملی مسائل پر مزاحمت اور جدوجہد کے دوران رائے عامہ کا لحاظ ضرور رکھا جائے۔

خدمت خلق

خدمت خلق رائے عامہ پر اثر اندازی کا بہت ہی موثر طریقہ ہے۔ جو آدمی انسانوں کا ہم درد اور غم خوار ہوتا ہے اس کی باتوں اور نصیحتوں کو ایک ہم درد کی نصیحت کی حیثیت سے خود بخود وزن حاصل ہوجاتا ہے۔ مکّہ میں رسول اللہ ﷺ کی امیج دو پہلوؤں سے بہت ممتاز تھی۔ ایک امیج تو آپ کے اعلی ترین پاکیزہ کردار کے حوالے سے صادق و امین کی امیج تھی اور دوسرے آپ کی انسان نوازی اور غم خواری کے حوالے سے یہ امیج عام تھی کہ آپ غریبوں کی مدد کرنے والے، ضرورت مندوں کے کام آنے والے اور تمام انسانوں کے ہمدرد و خیر خواہ ہیں۔ انبیا علیہم السلام کی بھی اپنی اپنی قوموں میں یہی امیج تھی کہ وہ ناصح امین یعنی ایسے خیر خواہ ہیں جن کی خیر خواہی قابل اعتماد ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ ایک اہم ضرورت ہے کہ وہ اپنی یہ امیج بنائیں کہ وہ رب رحمان و رحیم کے نام لیوا، رحمۃ للعالمین کے امتی اور دین رحمت کے ماننے والے ہیں اس لیے ملک کے عام لوگوں کے لیے باعث رحمت ہیں۔ یہ امیج

یعنی انسانوں کے خیر خواہ خادم کی امیج ہر فرد کی بھی بننی چاہیے، جماعتوں کی بھی اور پوری امت کی بھی۔ اس لیے کہ فرد بھی دین کا داعی ہے اور جماعت بھی۔ اس کے لیے درج ذیل تین باتیں ضروری ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ خدمت کا مزاج مسلمانوں میں عام کیا جائے۔ یہ مزاج مسلمانوں میں الحمد للہ پایا جاتا ہے۔ کووڈ کی لہر کے دوران مسلمانوں کے اس عمومی مزاج کی واضح شہادت سامنے آئی اور ملک کی رائے عامہ پر اس کے ممکنہ اثرات کا بھی بڑا سبق آموز تجربہ ہوا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس مزاج کی افزائش اور اس کے نتیجہ خیز استعمال کی طرف توجہ دی جائے۔

(۲) یہ مزاج عام کیا جائے کہ خدمت کا کام صرف مسلمانوں میں نہیں کرنا ہے بلکہ ملک کے تمام انسانوں کے درمیان کرنا ہے۔ اسی کے نتیجے میں رائے عامہ پر مثبت اثر اندازی کا فائدہ حاصل ہوگا۔ عام آفتوں (آفات سماوی یا فسادات وغیرہ) کے موقعے پر تو اکثر مسلمان بلا تفریق مذہب وملت آگے بڑھ کر اپنی خدمات انجام دیتے ہیں لیکن اس بات کی ضرورت ہے کہ خدمت کے مستقل مراکز اور رفاہی ادارے بھی اپنے دروازے سب کے لیے کھولیں اور سب کی خدمت کو اپنی پہچان بنائیں۔ مسلمان علاقوں کے علاوہ، مسلمان دوسری بستیوں اور محلوں میں بھی جاکر ادارے اور مراکز کھولیں۔

(۳) خدمت کا کام دعوت اور اصلاح کے کام سے الگ نہیں ہے۔ خدمت کرنے والے ہر فرد اور خدمت کے اداروں کے ہر والنٹیر کے سامنے دین اسلام کی تعلیمات پیش نظر رہیں۔ وہ لوگوں کے دنیا کے دکھ بھی دور کرے اور ساتھ ہی ساتھ آخرت کی نجات کی بھی فکر کرے۔ خدمت کرتے ہوئے، چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے وہ لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کرے اور ان کی سوچ کو درست رخ دے۔ اس کے لیے خدمت کرنے والوں کی مناسب تربیت کرنا ایک اہم کام ہے جس پر توجہ کی ضرورت ہے۔

ادارے

اجتماعی ادارے اسلام کی اور خاص طور پر اجتماعی زندگی سے متعلق اسلام کی شہادت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اس وقت مکمل اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاستیں موجود نہیں ہیں جو اسلام کی برکتوں

کا دنیا کو نظارہ کرا سکیں۔ ایسی صورت میں ادارے محدود پیمانے پر ہی سہی، یہ کام کر سکتے ہیں۔ اپنے ماحول اور کارکردگی سے وہ غیر اسلامی صحرا میں اسلام کے ایسے نخلستان بن سکتے ہیں جہاں کی ٹھنڈی ہوا، سائے اور میٹھے پانی کی طرف ہر پیاسا مسافر کشش محسوس کر سکے۔ اس موضوع کو آئندہ ہم تفصیل سے زیر بحث لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان شاء اللہ العزیز۔ سر دست کچھ اہم اصولی باتوں کے ذکر پر اکتفا کر رہے ہیں۔

(۱) ہمارے اداروں کے پیش نظر یہ مقصد واضح طور پر رہے کہ انھیں اسلام کی عملی شہادت کا فریضہ انجام دینا ہے۔ سب سے اہم ادارہ مسجد ہے۔ مسجدوں کے سامنے یہ بات رہے کہ ان کا کام صرف نماز کے لیے جگہ فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ اسلامی زندگی کے جن جن پہلوؤں کا بھی عملی نمونہ سامنے لانا ممکن ہو، انھیں سامنے لانا بھی ان کا کام ہے۔ مسجد صفائی اور پاکیزگی کا نمونہ ہو، یہاں تنازعات حل ہوتے ہوں، سماج کے مختلف مسائل پر بر وقت اور درست رہ نمائی ہوتی ہو، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا نمونہ اور بستی کی مسلم و غیر مسلم آبادی کے لیے مختلف طریقوں سے باعث رحمت ہو، ماحولیاتی تقاضوں کا لحاظ رکھا جاتا ہو۔ اس طرح کے مختلف پہلوؤں سے ہماری مسجدیں اسلامی تعلیمات کا عملی ماڈل بنیں اور لوگوں کو اسے دیکھنے اور محسوس کرنے کے مواقع ملتے رہیں۔

(۲) اسی طرح ہمارے تعلیمی ادارے اسلام کے تصور تعلیم کے نمائندہ اور اس کی عملی شہادت دینے والے بنیں۔ وہ صرف کتابیں پڑھانے کے نہیں بلکہ صحیح معنوں میں کردار سازی کے مراکز ہوں۔ ملک کے بعض بڑے مسلم اداروں میں برادران وطن اپنی لڑکیوں کو اس لیے شریک کراتے ہیں اور انہیں ترجیح دیتے ہیں کہ یہاں انھیں زیادہ محفوظ ماحول میسر آتا ہے۔ اس طرح مختلف معاملات میں ہمارے تعلیمی اداروں کی اچھی امیج بننے لگے اور وہ عملاً یہ نمونہ پیش کرنے میں کام یاب ہوں کہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں بچوں کی شخصیت سازی بہترین خطوط پر ہوتی ہے تو یہ بہت طاقت ور شہادت ہوگی۔ ہمارے اسپتال اسلام کے نظام صحت کے علم بردار اور اس کا عملی نمونہ پیش کرنے والے ہوں جہاں صحت کا مطلب کلی صحت (holistic health) اور علاج کا مطلب کلی علاج (holistic treatment) ہو، انسان کو صرف جسم سمجھ کر علاج کے عمل کو صرف کیمیاوی تعاملات اور چیر پھاڑ تک محدود نہ سمجھا جاتا ہو

بلکہ علاج کے جذباتی، اخلاقی اور روحانی پہلوؤں پر بھی یکساں توجہ دی جاتی ہو۔ ہمارے مالیاتی ادارے اسلام کے معاشی عدل اور سود سے پاک اور شراکت داری پر مبنی مالیاتی تصور کی عملی گواہی دینے والے ہوں۔ رفاہی وفلاحی ادارے اسلام کی انسان دوستی، مساوات اور مکمل فوز وفلاح کے اسلامی تصور کے علم بردار ہوں۔ وغیرہ۔

(۳) اس شہادت کے لیے ضروری ہے کہ ان اداروں کے پاس اول روز سے یہ وژن ہو کہ انھیں صرف خدمات فراہم کرنے کا کام نہیں کرنا ہے اور نہ ہی صرف مفت یا کم قیمت خدمات کی فراہمی تک ان کا مقصد محدود ہے۔ ان کا اصل مقصد متعلقہ محاذ پر اسلام کی شہادت اور اس کی تعلیمات کا عملی نمونہ سامنے لانا ہے۔ اس کے لیے انھیں اپنے تمام کاموں کو اسی انداز سے منظم کرنا ہے اور اپنے کام کے بالکل نئے طریقے اور پروسیس تشکیل دینے ہیں۔ مثلاً ایک مسلمان اسپتال کا طریقہ علاج اور اس کے ایس او پی اور پروٹوکول، عام اسپتال سے مختلف ہوں گے۔ یہ اسی وقت ہوگا جب اول روز سے عملی شہادت کا واضح وژن ان کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ یہ وژن سامنے ہوگا تو وہ حسب سہولت اس حوالے سے لوگوں کی تعلیم اور ذہن سازی کی بھی کوشش کریں گے۔ مثلاً ہمارے مالیاتی اداروں کے در و دیوار پر ایسے تعلیمی چارٹ ضرور آویزاں رہیں گے جو اسلام کے مالیاتی تصورات کی انفرادیت واضح کریں گے۔ وہ اپنے گاہکوں کے لیے اسلامی معاشیات اور مالیات پر مسلسل بیداری اور تعلیم کے پروگرام منعقد کرتے رہیں گے۔ مسلمان اسکول سرپرستوں کو برابر بتاتا رہے گا کہ اسلام کے مطابق تعلیم کے حقیقی مقاصد کیا ہیں۔ اس پر ضروری لٹریچر ان کو فراہم کیا جاتا رہے گا۔ اسپتال میں ڈاکٹر دوا کے ساتھ ساتھ اللہ پر توکل کی، دعا کی، صدقہ وخیرات کی اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے کی بھی برابر تلقین کرتا رہے گا۔

۴۔ ادارے کے مخصوص میدان کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ادارے کا مجموعی ماحول بھی اسلام کی شہادت کا ذریعہ بنے۔ وہاں اگر مرد وخواتین دونوں کام کرتے ہوں تو اسلام میں مرد وخواتین کے درمیان رابطے سے متعلق جو حدود بتائے گئے ہیں اور جو ہدایات دی گئی ہیں، ان کا عملی نمونہ سامنے آئے، آجر و مستاجر کے درمیان تعلق، کام کے سلسلے میں دیانت داری، عوامی وسائل کے استعمال میں احتیاط اور تقویٰ کا رویہ، قانون کی پابندی، عام لوگوں سے حسن سلوک، ان سب امور میں ادارہ، اس

کا ماحول، اس کے اصول وضوابط، اس کی مرکزی قدریں (core values) اس سے متعلق لوگ، سب اسلام کی مختلف تعلیمات اور اسلامی اخلاق کے نمائندہ اور اس شہادت دینے والے ہوں، ادارے کی یہ مسلسل کوشش ہونی چاہیے۔ بدقسمتی سے عام ادارے تو کجا، دین دار لوگوں بلکہ دینی تنظیموں کی جانب سے چلائے جا رہے بیشتر ادارے بھی اس ہدف سے اس وقت کافی دور ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ اس پہلو سے اصلاح احوال کی ٹھوس اور مسلسل کوشش رائے عامہ پر اثر اندازی کی ایک اہم ضرورت ہے اس لیے کہ جیسا کہ عرض کیا گیا، انفرادی زندگی سے متعلق امور میں عملی شہادت پیش کرنے والے مثالی کردار کے حامل لوگ تو مل سکتے ہیں لیکن اجتماعی سطح پر اسلام کی شہادت کا ذریعہ اس وقت صرف ادارے ہی ہیں۔

۵۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اداروں کے منتظمین کی اور وہاں کے عملے کی ان پہلوؤں سے مسلسل تربیت کا اہتمام ہوتا رہے، اس مقصد کے لیے خصوصی لٹریچر تیار ہو اور یہ کام ایک تحریک بن جائے، تاکہ مسلمانوں کے ادارے بھی عملی شہادت کا اور اس کے نتیجے میں رائے عامہ کی تربیت کا ٹھوس ذریعہ بن جائیں۔

حواشی وحوالہ جات

[1] سید سعادت اللہ حسینی (2023)؛ اشارات (تعلقاتی قوت اور نافعیت)، ماہنامہ زندگی نو؛ اکتوبر 2023:ص12-14

[2] حوالہ سابق ص15-19

[3] سید سعادت اللہ حسینی (2024)؛ اشارات (رائے عامہ اوراس کی تبدیلی)، ماہنامہ زندگی نو؛ اگست 2024:ص13-14

[4] تفصیل ملاحظہ ہو

سید سعادت اللہ حسینی (2024)؛ اشارات (رائے عامہ اوراس کی تبدیلی)، ماہنامہ زندگی نو؛ اگست 2024؛ (ذیلی سرخی 'خاموشی، اعراض اور نظر انداز کرنے کی پالیسی ص19-17)

[5] حوالہ سابق

[6] سید سعادت اللہ حسینی (2024)؛ اشارات (رائے عامہ اوراس کی تبدیلی)، ماہنامہ زندگی نو؛ اگست 2024: ص16

[7] سید سعادت اللہ حسینی (2021) اصلاح معاشرہ: منصوبہ بندی عملی طریقے؛ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز؛ نئی دہلی۔ صفحات 40-27

[8] اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے بعض علاقوں میں ان حوالوں سے مسلمانوں پر جائز اور معقول رویوں پر بھی ناروا بندشیں عائد کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان ظالمانہ کوششوں کی ضرور مزاحمت ہونی چاہیے لیکن بہر حال بے جا اور اذیت ناک استعمالات سے گریز بھی ضروری ہے کہ یہ احتیاط اسلامی اصول اور اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے۔

[9] مسجدوں میں عام طور پر خواتین جائیں یا نہ جائیں، اس پر یقیناً فقہی آرا الگ الگ ہیں اور یہاں یہ مسئلہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ ضرورت کے پیش نظر، مثلاً بازاروں میں، سڑکوں پر، تعلیمی اداروں اور دفتروں میں جہاں نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد جانا خواتین کی ضرورت ہو، وہاں مسجد میں داخلہ کسی کے یہاں بھی ممنوع نہیں ہے۔ لیکن عملاً کئی جگہ ایسی صورت حال ہے جیسے عورت مسجد میں داخل ہوجائے تو گویا بڑا جرم سرزد ہو گیا۔ ہمارے پیش نظر اس رویے کی اصلاح ہے۔

[10] ان امور پر تفصیل سے درج ذیل کتاب میں بحث ہو چکی ہے:

سید سعادت اللہ حسینی (2018) خواتین میں اسلامی تحریک؛ ہدایت پبلشرز؛ نئی دہلی

[11] سید سعادت اللہ حسینی (2022) ہندتو انتہاپسندی، نظریاتی کشمکش اور مسلمان؛ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز؛ نئی دہلی۔■



تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت سے
برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو
اے رہرو فرزانہ رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو صحرا ہے تو طوفاں ہو

علامہ اقبال